ایک حیرت انگیز انکشاف

مولانا دوست محمد شاہد
مؤرخ احمدیت

ہمیں کچھ کیں نہیں بھائیو نصیحت ہے غریبانہ
کوئی جو پاک دِل ہووے دل و جاں اُس پہ قرباں ہے

ایک حیرت انگیز انکشاف

مولانا دوست محمد شاہد
مؤرخ احمدیت

احمد اکیڈمی ربوہ

"اسلام ..... ایسا چمکتا ہوا ہیرا ہے جس کا ہر ایک گوشہ چمک رہا ہے۔ ایک بڑے محل میں بہت سے چراغ ہوں اور کوئی چراغ کسی دریچہ سے نظر آوے اور کوئی کسی کو نہ سے۔ یہی حال اسلام کا ہے کہ اس کی آسمانی روشنی صرف ایک ہی طرف سے نظر نہیں آتی بلکہ ہر ایک طرف سے اس کے ابدی چراغ نمایاں ہیں اس کی تعلیم بجائے خود ایک چراغ ہے اور جو شخص اس کی سچائی کے اظہار کے لیے خدا کی طرف سے آتا ہے وہ بھی ایک چراغ ہوتا ہے۔"

(پیغام صلح صہ ۶۲ از حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہ)

عرضِ ناشر

مکرم الحاج ڈاکٹر شیخ محمد حنیف صاحب امیر جماعت ہائے احمدیہ کوئٹہ وبلوچستان نے اس کتاب کی اشاعت میں گراں قدر تعاون فرمایا ہے احباب کرام کی خدمت میں درخواست ہے کہ محترم شیخ محمد حنیف صاحب کے والدین کی مغفرت اور بلندئ درجات کے لیے دُعا کریں نیز محترم شیخ صاحب کے اہلِ خانہ کے لیے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے انہیں ہر مشکل دکھ اور تکلیف سے بچائے اور اپنے فضل سے دینی اور دنیاوی ترقیات سے نوازتا چلا جائے۔ آمین!

خاکسار
جمال الدین انجم
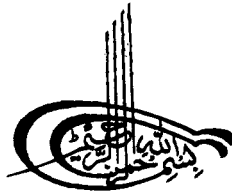
دینِ اسلام واحد قانونِ آسمانی اور ابدی اور کامل و مکمل ضابطۂ حیات ہے
جس کا ہر حکم حق و حکمت پر مبنی اور رُوحانی فلسفہ سے پُر ہے اور اس کی پشت پر عقل و فہم
اور تدبیر و فقاہت کی افواج صف بستہ کھڑی ہیں جو دلی اور دماغی قویٰ کی حفاظت
کر رہی ہیں اور سورۂ جمعہ کے پہلے رکوع میں یہ خبر دی گئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ
وسلم کی قوّتِ قدسیہ کے طفیل آخرین جہاں ربّانی نشانوں کا مشاہدہ کریں گے، تزکیۂ
نفوس کا سامان ہوگا اور تعلیمِ کتاب کی برکت پائیں گے، وہاں کتاب اللہ کی حکمت اور
فلسفہ بھی ان پر کھولا جائے گا اور بانیٔ سلسلہ احمدیہ حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام
کا پیدا کردہ عظیم الشّان لٹریچر ان سب پہلوؤں پر مشتمل اور حاوی ہے خصوصاً اسلامی
عقائد و نظریات اور فقہی مسائل و مضامین اور دیگر تعلیموں اور اُصولوں کی فلاسفی اور حکمت
جس حکیمانہ شان سے اُجاگر کی ہے اس کی کوئی نظیر نہیں حضور نے اپنے مخصوص اندازِ
بیان سے تمام اسلامی مسائل کو ایسے آسان مگر پُر شوکت طریق پر حل کیا ہے کہ شریعتِ اسلامیہ
کا مغز اور اس کی حقیقت و عظمت دل پر نقش ہو جاتی ہے اور زبان پر محسنِ اعظم فخرِ موجودات

محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے درود جاری ہوجاتا ہے۔ کل برکۃ من محمد صلی اللہ علیہ وسلم فتبارک من علم وتعلم۔ ؎

جو رازِ دیں تھے بھارے اس نے بتائے سارے
دولت کا دینے والا فرمانروا یہی ہے
سب ہم نے اُس سے پایا شاہد ہے تو خُدایا
وہ جس نے حق دکھایا وہ مہ لقا یہی ہے

(دُرِّثمین)

حضرت اقدسؑ کے بلند پایہ لٹریچر کو حق تعالیٰ نے ایسی مقبولیت بخشی ہے کہ مختلف مکاتیبِ فکر کے چوٹی کے دینی راہ نماؤں اور پیشواؤں نے اس سے بھرپور استفادہ کر کے عملی طور پر اس کی فوقیت اور برتری کا اعتراف کیا ہے جس کی ایک حیرت انگیز مثال جناب مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی کی کتاب "احکامِ اسلام عقل کی نظر میں" ہے جو پہلی بار ۱۹۴۷ء سے قبل انڈیا میں چھپی اور پاکستان میں اس کی اشاعت مئی ۱۹۷۸ء میں ہوئی۔ جناب مولانا محمد رضی عثمانی صاحب نے جن کے زیرِ اہتمام پاکستانی ایڈیشن زیورِ طبع سے آراستہ ہوا ناشر کی حیثیت سے اس کے صفحہ ۴ پر حسبِ ذیل نوٹ لکھا ہے :۔

" حکیم الامت مجدد الملت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کو اللہ تعالیٰ نے حقیقت میں اُمت کا نبض شناس اور ان کی اصلاح وعلاج کیلئے حکیم

بنایا تھا۔ آپ حقیقت میں شبلیٔ وقت اور اس دَور کے غزالی اور رازی تھے گزشتہ نصف صدی سے زیادہ عرصہ میں آپکی مفید و مقبول تصانیف سے ملّتِ اسلامیہ کو جو فوائد حاصل ہوئے وہ ہر دیندار مسلمان پر اظہر من الشمس ہیں .... تصانیف کی طویل فہرست میں ایک بہت اہم اور مفید تصنیف المصالح العقلیہ لاحکام النقلیہ ہے جس میں تمام شرعی احکام کی عقلی حکمتیں و مصلحتیں اور احکام الٰہیہ کے اسرار و رموز اور فلاسفی ظاہر کی گئی ہے اور عام فہم انداز میں ثابت کیا ہے کہ تمام احکام شریعت عین عقل کے مطابق ہیں۔ کتاب کے تینوں حصّوں کی ترتیب فقہی ابواب پر رکھی گئی ہے۔ یہ کتاب تقسیم ہند سے قبل ۱۳۶۸ھ میں ادارہ اشرف العلوم (جو دارالاشاعت دیوبند یوپی انڈیا کا ذیلی ادارہ تھا) سے شائع ہوکر قبولیتِ عام حاصل کر چکی ہے، لیکن افسوس کہ پاکستان میں اس کی طباعت کا موقع نہ مل سکا اب خدا کا شکر ہے کہ یہ کتاب "احکامِ اسلام عقل کی نظر میں" کے عام فہم نام کے ساتھ دارالاشاعت کراچی نمبرا سے پھر شائع کی جارہی ہے۔"

زیرِ نظر مختصر مقالہ میں یہ بتانا مقصود ہے کہ اس "مقبول عام" تصنیف کے اہم مآخذ میں سرِفہرست حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہ کا لٹریچر ہے جس کے بکثرت فقرے ہی نہیں، صفحوں کے صفحے بھی خفیف سے تصرف کے ساتھ لفظاً لفظاً زینتِ

کتاب ہوئے ہیں اور اپنی قوت و شوکت کے انوار کی بدولت ستاروں کی طرح چمک رہے ہیں جیسا کہ آئندہ تفصیل سے عیاں ہوگا۔ مگر اس تفصیل میں جانے سے قبل یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ یہ وہی "شبلیٔ وقت" اور "غزالی دوراں" ہیں جن کا عقیدہ ابتداء میں یہ تھا کہ "احکام میں فلاسفی معلوم کرنا موجب الحاد ہوتا ہے اور عمل سے کورا کر دیتا ہے۔"

(خیر الافادات صفحہ ۱۰۸ ناشر ادارہ اسلامیات لاہور)

پنجوقتہ نمازوں کا فلسفہ

۱۔ حضرت اقدسؑ نے کشتی نوح صفحہ ۶۳، ۶۵ میں پنجوقتہ نمازوں کا حسب ذیل الفاظ میں نہایت لطیف فلسفہ بیان فرمایا ہے۔ حضرت اقدس فرماتے ہیں:۔

"پنجگانہ نمازیں کیا چیز ہیں۔ وہ تمہارے مختلف حالات کا فوٹو ہے تمہاری زندگی کے لازم حال پانچ تغیر ہیں جو بلا کے وقت تم پر وارد ہوتے ہیں اور تمہاری فطرت کے لیے ان کا وارد ہونا ضروری ہے۔

۱۔ پہلے جبکہ تم مطلع کئے جاتے ہو کہ تم پر ایک بلا آنے والی ہے مثلاً جیسے تمہارے نام عدالت سے ایک وارنٹ جاری ہوا۔ یہ پہلی حالت ہے جس نے تمہاری تسلی اور خوشحالی میں خلل ڈالا۔ سو یہ حالت زوال کے وقت سے مشابہ ہے کیونکہ اس سے تمہاری خوشحالی میں زوال آنا شروع ہوا اس کے مقابل پہ نمازِ ظہر متعین ہوئی جس کا وقت زوالِ

آفتاب سے شروع ہوتا ہے۔

۲۔ دوسرا تغیر اس وقت تم پر آتا ہے جبکہ تم بلا کے محل سے بہت نزدیک کئے جاتے ہو۔ مثلاً جبکہ تم بذریعہ وارنٹ گرفتار ہو کر حاکم کے سامنے پیش ہوتے ہو۔ یہ وہ وقت ہے کہ جب خوف سے خون خشک ہو جاتا ہے اور تسلّی کا نور تم سے رخصت ہونے کو ہوتا ہے۔ سو یہ حالت تمہاری اُس وقت سے مشابہ ہے جبکہ آفتاب سے نُور کم ہو جاتا ہے اور نظر اس پر جم سکتی ہے اور صریح نظر آتا ہے کہ اب اس کا غروب نزدیک ہے۔ اس روحانی حالت کے مقابل پر نماز عصر مقرر ہوئی۔

۳۔ تیسرا تغیر تم پر اس وقت آتا ہے جو اس بلا سے رہائی پانے کی بکلّی اُمید منقطع ہو جاتی ہے۔ مثلاً جیسے تمہارے نام فرد قرار داد جُرم لکھی جاتی ہے اور مخالفانہ گواہ تمہاری ہلاکت کے لیے گُزر جاتے ہیں۔ یہ وہ وقت ہے کہ جب تمہارے حواس خطا ہو جاتے ہیں اور تم اپنے تئیں ایک قیدی سمجھنے لگتے ہو سو یہ حالت اس وقت سے مشابہ ہے جبکہ آفتاب غروب ہو جاتا ہے اور تمام امیدیں دن کی روشنی کی ختم ہو جاتی ہیں۔ اس روحانی حالت کے مقابل پر نماز مغرب مقرر ہے۔

۴۔ چوتھا تغیر اس وقت تم پر آتا ہے کہ جب بلا تم پر وارد ہی ہو جاتی ہے اور اس کی سخت تاریکی تم پر احاطہ کر لیتی ہے۔ مثلاً جبکہ فرد قرار داد جُرم اور

شہادتوں کے بعد حکم سزا تم کو سنا دیا جاتا ہے اور قید کے لیے ایک پولیس مین کے تم حوالہ کیئے جاتے ہو۔ سو یہ حالت اس وقت سے مشابہ ہے جبکہ رات پڑ جاتی ہے اور ایک سخت اندھیرا پڑ جاتا ہے۔ اس رُوحانی حالت کے مقابل پر نماز عشاء مقرر ہے۔

۵۔ پھر جب کہ تم ایک مدت تک اس مصیبت کی تاریکی میں بسر کرتے ہو تو پھر آخر خدا کا رحم تم پر جوش مارتا ہے اور تمہیں اس تاریکی سے نجات دیتا ہے۔ مثلاً جیسے تاریکی کے بعد پھر آخر کار صبح نکلتی ہے اور پھر وہی روشنی دن کی اپنی چمک کے ساتھ ظاہر ہو جاتی ہے۔ سو اس روحانی حالت کے مقابل پر نماز فجر مقرر ہے اور خدا نے تمہارے فطرتی تغیرات میں پانچ حالتیں دیکھ کر پانچ نمازیں تمہارے لیے مقرر کیں۔ اس سے تم سمجھ سکتے ہو کہ یہ نمازیں خاص تمہارے نفس کے فائدہ کے لیے ہیں۔ پس اگر تم چاہتے ہو کہ ان بلاؤں سے بچے رہو تو پنجگانہ نمازوں کو ترک نہ کرو کہ وہ تمہارے اندرونی اور روحانی تغیرات کا ظل ہیں نمازیں آنے والی بلاؤں کا علاج ہے۔ تم نہیں جانتے کہ نیا دن چڑھنے والا کس قسم کے قضاء و قدر تمہارے لیے لائے گا۔ پس قبل اس کے جو دن چڑھے تم اپنے مولیٰ کی جناب میں تضرّع کرو کہ تمہارے لیے خیر و برکت کا دن چڑھے۔"

(کشتی نوح صفحہ ۶۳ - ۶۵ طبع اوّل ۱۹۰۲ء)

یہ سارا اقتباس کتاب "احکام اسلام" صفحہ ۴۹ سے ۵۱ تک درج ہے۔

اسلام کا فلسفۂ اخلاق

۲۔ حضرت اقدسؑ اپنی مشہور کتاب "نسیمِ دعوت" میں اسلام کے فلسفۂ اخلاق پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ :۔

"انسان کی فطرت پر نظر کر کے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو مختلف قویٰ اس غرض سے دیئے گئے ہیں کہ تا وہ مختلف وقتوں میں حسبِ تقاضا محل اور موقعہ کے ان قویٰ کو استعمال کرے۔ مثلاً انسان میں منجملہ اور خُلقوں کے ایک خُلق بکری کی فطرت سے مشابہ ہے اور دوسرا خُلق شیر کی صفت سے مشابہت رکھتا ہے۔ پس خدائے تعالیٰ انسان سے یہ چاہتا ہے کہ وہ بکری بننے کے محل میں بکری بن جائے اور شیر بننے کے محل میں وہ شیر ہی بن جائے اور جیسا کہ وہ نہیں چاہتا کہ ہر وقت انسان سوتا ہی رہے یا ہر وقت جاگتا ہی رہے یا ہر دم کھاتا ہی رہے یا ہمیشہ کھانے سے منہ بند رکھے۔ اسی طرح وہ یہ بھی نہیں چاہتا کہ انسان اپنی اندرونی قوتوں میں سے صرف ایک قوت پر زور ڈال دے اور دوسری قوتیں جو خدا کی طرف سے اس کو ملی ہیں۔ اس کو لغو سمجھے۔ اگر انسان میں خدا نے ایک قوت حلم اور نرمی اور درگذر اور صبر کی رکھی ہے تو اسی خدا نے اس میں ایک قوتِ غضب اور خواہش انتقام کی بھی رکھی

ہے پس کیا مناسب ہے کہ ایک خداداد قوت کو تو حد سے زیادہ استعمال کیا جائے اور دوسری قوت کو اپنی فطرت میں سے بکلی کاٹ کر پھینک دیا جائے اس سے تو خدا پر اعتراض آتا ہے کہ گویا اس نے بعض قوتیں انسان کو ایسی دی ہیں جو استعمال کے لائق نہیں۔ کیونکہ یہ مختلف قوتیں اسی نے تو انسان میں پیدا کی ہیں۔ پس یاد رہے کہ انسان میں کوئی بھی قوت بُری نہیں ہے بلکہ اُن کی بداستعمالی بُری ہے سو انجیل کی تعلیم نہایت ناقص ہے جس میں ایک ہی پہلو پر زور دیا گیا ہے۔ علاوہ اس کے دعویٰ تو ایسی تعلیم کا ہے کہ ایک طرف طمانچہ کھا کر دوسری بھی پھیر دیں مگر اس دعویٰ کے موافق عمل نہیں ہے مثلاً ایک پادری صاحب کو کوئی طمانچہ مار کر دیکھے کہ پھر عدالت کے ذریعہ سے وہ کیا کارروائی کراتے ہیں۔ پس یہ تعلیم کس کام کی ہے۔ جس پر نہ عدالتیں چل سکتی ہیں۔ نہ پادری چل سکتے ہیں۔ اصل تعلیم قرآن شریف کی ہے جو حکمت اور موقعہ شناسی پر مبنی ہے مثلاً انجیل نے تو یہ کہا کہ ہر وقت تم لوگوں کے طمانچے کھاؤ اور کسی حالت میں شر کا مقابلہ نہ کرو مگر قرآن شریف اس کے مقابل پر یہ کہتا ہے

جزاء سیئۃ سیئۃ مثلہا فمن عفا واصلح فاجرہ

علی اللہ ۔

یعنی اگر کوئی تمہیں دُکھ پہنچا دے مثلاً دانت توڑ دے یا آنکھ پھوڑ دے تو اس کی سزا اسی قدر بدی ہے جو اس نے کی لیکن اگر تم ایسی صورت میں گناہ معاف کر دو کہ اس معافی کا کوئی نیک نتیجہ پیدا ہو اور اس سے کوئی اصلاح ہو سکے یعنی مثلاً مجرم آئندہ اس عادت سے باز آ جائے تو اس صورت میں معاف کرنا بھی بہتر ہے اور اس معاف کرنے کا خدا سے اجر ملے گا ۔

اب دیکھو اس آیت میں دونوں پہلو کی رعایت رکھی گئی ہے اور عفو اور انتقام کو مصلحتِ وقت سے وابستہ کر دیا گیا ۔ سو یہی حکیمانہ مسلک ہے جس پر نظام عالم چل رہا ہے ۔ رعایتِ محل اور وقت سے گرم اور سرد دونوں کا استعمال کرنا ہی عقلمندی ہے ۔ جیسا کہ تم دیکھتے ہو کہ ہم ایک ہی قسم کی غذا پر ہمیشہ زور نہیں ڈال سکتے بلکہ حسبِ موقع گرم اور سرد غذائیں بدلتے رہتے ہیں اور جاڑے اور گرمی کے وقتوں میں کپڑے بھی مناسبِ حال بدلتے رہتے ہیں ۔

پس اسی طرح ہماری اخلاقی حالت بھی حسبِ موقع تبدیلی کو چاہتی ہے ایک وقت رُعب دکھلانے کا مقام ہوتا ہے وہاں نرمی اور درگزر سے کام بگڑتا ہے اور دوسرے وقت نرمی اور تواضع کا موقع ہوتا ہے

اور وہاں رُعب دکھلانا سفلہ پن سمجھا جاتا ہے۔ غرض ہر ایک وقت اور ہر ایک مقام ایک بات کو چاہتا ہے۔ پس جو شخص رعایت مصالح اوقات نہیں کرتا۔ وہ حیوان ہے نہ انسان اور وہ وحشی ہے نہ مہذّب"۔

(نسیم دعوت صفحہ ۱۷، ۲۷ طبع اول ۱۹۰۳ء)

یہ رُوح پرور مضمون مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کی کتاب "احکام اسلام عقل کی نظر میں" کے صفحہ ۲۲۳ اور ۲۲۴ میں اوّل سے آخر تک بعینہٖ نقل شدہ موجود ہے۔

حرمت خنزیر کا فلسفہ

۳۔ کتاب "احکام اسلام" (صفحہ ۲۰۴) میں "وجوہ حرمت خنزیر" کے زیر عنوان حسب ذیل عبارت مندرج ہے جو حضرت اقدس کی معرکہ آراء کتاب "اسلامی اُصول کی فلاسفی" کے صفحہ ۲۴ (طبع اوّل) سے مستعار لی گئی ہے۔

"اس بات کا کس کو علم نہیں کہ یہ جانور اوّل درجہ کا نجاست خور اور نیز بے غیرت اور دیّوث ہے۔ اب اس کے حرام ہونے کی وجہ ظاہر ہے کہ قانونِ قدرت یہی چاہتا ہے کہ ایسے پلید اور بد جانور کے گوشت کا اثر بھی بدن اور روح پر بھی پلید ہی ہو کیونکہ ہم ثابت کر چکے ہیں کہ غذاؤں کا بھی انسان کی رُوح پر ضرور اثر ہوتا ہے۔ پس اس میں کیا شک

ہے کہ ایسے بد کا اثر بھی بد ہی پڑے گا جیسا کہ یونانی طبیبوں نے اسلام سے پہلے ہی یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اس جانور کا گوشت بالخاصیّت حیا کی قوّت کو کم کرتا ہے اور دیوثی کو بڑھاتا ہے۔"

("اسلامی اُصول کی فلاسفی" صفحہ ۲۴ طبع اوّل ۱۸۹۶ء)

عفّت کے اسلامی خُلق کا فلسفہ

۴۔ "اسلامی اصول کی فلاسفی" میں حضرت اقدسؑ نے عفت کے اسلامی خُلق اور اسلامی پردہ کی حقیقت و حکمت بھی نہایت وضاحت سے بیان فرمائی ہے جو مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نے حضور کا حوالہ دیئے بغیر حضور ہی کے الفاظ میں شامل کتاب فرمائی ہے جو یہ ہے۔

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ۱؎ وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ ۲؎ وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ وَتُوْبُوْا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَا الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ

۱؎ سورۃ نمبر ۲۴ : ۳۱ ۲؎ ۲۴ : ۳۲

تُفْلِحُوْنَ ۔[1] وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ط وَسَآءَ سَبِيْلًا ۝[2] وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا ۔[3] وَرَهْبَانِيَّةَ اِۨبْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ۔[4]

یعنی ایمانداروں کو جو مرد ہیں کہدے کہ آنکھ کو نامحرم عورتوں کو دیکھنے سے بچائے رکھیں اور ایسی عورتوں کو کُھلے طور پر سے نہ دیکھیں جو شہوت کا محل ہوسکتی ہیں اور ایسے موقعوں پر خوابیدہ نگاہ کی عادت پکڑیں اور اپنے سَتر کی جگہ کو جس طرح ممکن ہو بچاویں۔ ایسا ہی کانوں کو نامحرموں سے بچاویں یعنی بے گانہ عورتوں کے گانے بجانے اور خوش الحانی کی آوازیں نہ سنے۔ ان کے حسن کے قصّے نہ سنے۔ یہ طریق پاک نظر اور پاک دل رہنے کے لیے عمدہ طریق ہے۔ ایسا ہی ایماندار عورتوں کو کہدے کہ وہ بھی اپنی آنکھوں کو نامحرم مردوں کے دیکھنے سے بچائیں اور اپنے کانوں کو بھی نامحرموں سے بچائیں یعنی ان کی پُر شہوات آوازیں نہ سُنیں اور اپنے ستر کی جگہ کو پردہ میں رکھیں اور اپنی زینت کے

---

[1] ۲۴ : ۳۲ [2] ۱۷ : ۳۳ [3] ۲۴ : ۳۴

[4] ۵۷ : ۲۸

اعضاء کو کسی غیر محرم پر نہ کھولیں اور اپنی اوڑھنی کو اس طرح سر پر لیں
کہ گریبان سے ہو کر سر پر آجائے یعنی گریبان اور دونوں کان اور سر
اور کنپٹیاں سب چادر کے پردہ میں رہیں اور اپنے پیروں کو زمین پر
ناچنے والوں کی طرح نہ ماریں۔ یہ وہ تدبیر ہے کہ جس کی پابندی ٹھوکر
سے بچا سکتی ہے۔

اور دوسرا طریق بچنے کے لیے یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ کی طرف رجوع کریں
اور اس سے دُعا کریں" تا ٹھوکر سے بچا وے اور لغزشوں سے نجات دے۔
زنا کے قریب مت جاؤ۔ یعنی ایسی تقریبوں سے دور رہو جن سے یہ خیال بھی دل
میں پیدا ہو سکتا ہو اور ان راہوں کو اختیار نہ کرو جن سے اس گناہ کے وقوع
کا اندیشہ ہو۔ جو زنا کرتا ہے وہ بدی کو انتہا تک پہنچا دیتا ہے۔ زنا کی راہ
بہت بُری ہے یعنی منزلِ مقصود سے روکتی ہے اور تمہاری آخری منزل کے
لیے سخت خطرناک ہے اور جس کو نکاح میسّر نہ آوے چاہیئے کہ وہ اپنی عفت
کو دوسرے طریقوں سے بچا وے۔ مثلاً روزہ رکھے یا کم کھاوے یا اپنی
طاقتوں سے تن آزار کام لے اور لوگوں نے یہ طریق نکالے ہیں کہ وہ ہمیشہ عملاً"
نکاح سے دست بردار رہیں یا خوجے بنیں اور کسی طریق سے رہبانیت اختیار
کریں مگر ہم نے انسان پر یہ حکم فرض نہیں کیے اسی لیے وہ ان بدعتوں کو پورے
طور پر نبھا نہ سکے۔ خدا کا یہ فرمانا کہ ہمارا یہ حکم نہیں کہ لوگ خوجے بنیں۔ یہ اس

بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر خدا کا حکم ہوتا تو سب لوگ اس حکم پر عمل کرنے کے مجاز بنتے تو اس صورت میں بنی آدم کی قطع نسل ہو کر کبھی کا دنیا کا خاتمہ ہو جاتا اور نیز اگر اس طرح پر عفّت حاصل کرنی ہو کہ عُضو مردمی کاٹ دیں تو یہ در پردہ اس صانع پر اعتراض ہے جس نے وہ عضو بنایا اور نیز جبکہ ثواب کا تمام مدار اس بات میں ہے کہ ایک قوّت موجود ہو اور پھر انسان خدائے تعالیٰ کا خوف کر کے اس قوّت کے خراب جذبات کا مقابلہ کرتا رہے اور اس کے منافع سے فائدہ اٹھا کر دو طور کا ثواب حاصل کرے پس ظاہر ہے کہ ایسے عضو کے ضائع کر دینے میں دونوں ثوابوں سے محروم رہا۔ ثواب تو جذبہ مخالفانہ کے وجود اور پھر اس کے مقابلہ سے ملتا ہے لیکن جس میں بچہ کی طرح وہ قوّت ہی نہیں رہی؛ اس کو کیا ثواب ملے گا؟ کیا بچہ کو اپنی عفت کا ثواب مل سکتا ہے۔

ان آیات میں خدا تعالیٰ نے خُلق احصان یعنی عفت کے حاصل کرنے کے لیے صرف اعلیٰ تعلیم ہی نہیں فرمائی بلکہ انسان کو پاک دامن رہنے کے لیے پانچ علاج بھی بتلا دیئے ہیں یعنی یہ کہ اپنی[۱] آنکھوں کو نامحرم پر نظر ڈالنے سے بچانا کانوں[۲] کو نامحرموں کی آواز سُننے سے بچانا۔ نامحرموں[۳] کے قصّے نہ سُننا اور ایسی[۴] تمام تقریبوں سے جن میں اس بدفعل کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہو اپنے تئیں بچانا۔ اگر[۵] نکاح نہ ہو تو روزہ رکھنا وغیرہ۔

اس جگہ ہم بڑے دعویٰ کے ساتھ کہتے ہیں کہ یہ اعلیٰ تعلیم ان سب تدبیروں کے

ساتھ جو قرآن شریف نے بیان فرمائی ہیں صرف اسلام ہی سے خاص ہے اور اس جگہ ایک نکتہ یاد رکھنے کے لائق ہے اور وہ یہ ہے کہ چونکہ انسان کی وہ طبعی حالت جو شہوات کا منبع ہے جس سے انسان بغیر کسی کامل تغیر کے الگ نہیں ہو سکتا۔ یہی ہے کہ اس کے جذباتِ شہوت محل اور موقع پاکر جوش مارنے سے رہ نہیں سکتے۔ یا یوں کہو کہ سخت خطرہ میں پڑ جاتے ہیں۔ اس لیے خدا تعالیٰ نے ہمیں یہ تعلیم نہیں دی کہ ہم نامحرم عورتوں کو بلا تکلف دیکھ تو لیا کریں اور ان تمام زینتوں پر نظر ڈالیں اور ان کے تمام انداز ناچنا وغیرہ مشاہدہ کریں لیکن پاک نظر سے دیکھیں اور نہ یہ تعلیم ہمیں دی ہے کہ ہم ان بیگانہ جوان عورتوں کا گانا بجانا سُن لیں۔ اور ان کے حُسن کے قصے بھی سنا کریں لیکن پاک خیال سے سُنیں۔ بلکہ ہمیں تاکید ہے کہ ہم نامحرم عورتوں کو اور ان کی زینت کی جگہ کو ہرگز نہ دیکھیں۔ نہ پاک نظر سے اور نہ ناپاک خیال سے۔ بلکہ ہمیں چاہیئے کہ ان کے سُننے اور دیکھنے سے نفرت رکھیں جیسا کہ مردار سے "تا ٹھوکر نہ کھاویں کیونکہ ضرور ہے کہ بے قیدی کی نظروں سے کسی وقت ٹھوکریں پیش آویں۔ سو چونکہ خدا تعالیٰ چاہتا ہے کہ ہماری آنکھیں اور دل ہمارے خطرات سب پاک رہیں اس لیے اس نے یہ اعلیٰ درجہ کی تعلیم فرمائی۔ اس میں کیا شک ہے کہ بے قیدی ٹھوکر کا موجب ہو جاتی ہے اگر ہم ایک بھوکے کُتے کے آگے نرم نرم روٹیاں رکھدیں اور پھر ہم امید رکھیں کہ اس کُتے کے دل میں خیال تک ان روٹیوں کا نہ آوے تو ہم اپنے اس خیال میں غلطی پر ہیں۔ سو

خدا تعالیٰ نے چاہا کہ نفسانی قویٰ کو پوشیدہ کارروائیوں کا موقع بھی نہ ملے۔ اور ایسی کوئی بھی تقریب پیش نہ آئے جس سے بدخطرات جنبش کر سکیں۔

اسلامی پردہ کی یہی فلاسفی اور یہی ہدایت شرعی ہے۔ خدا تعالیٰ کی کتاب میں پردہ سے یہ مراد نہیں کہ فقط عورتوں کو قیدیوں کی حراست میں رکھا جائے۔ یہ ان نادانوں کا خیال ہے جن کو اسلامی طریقوں کی خبر نہیں بلکہ مقصود یہ ہے کہ عورت مرد دونوں کو آزادنظراندازی اور اپنی زینتوں کے دکھانے سے روکا جائے کیونکہ اس میں دونوں مرد اور عورت کی بھلائی ہے .... بالآخر یہ بھی یاد رہے کہ خوابیدہ نگاہ سے غیر محل پر نظر ڈالنے سے اپنے تئیں بچا لینا اور دوسری جائز النظر چیزوں کو دیکھنا۔ اس طریق کو عربی میں غضِّ بصر کہتے ہیں اور ہر ایک پرہیزگار جو اپنے دل کو پاک رکھنا چاہتا ہے، اس کو نہیں چاہیئے کہ حیوانوں کی طرح جس طرف چاہے بے محابا نظر اُٹھا کر دیکھ لیا کرے بلکہ اس کے لیے اس تمدنی زندگی میں غضِّ بصر کی عادت ڈالنا ضروری ہے اور یہ وہ مبارک عادت ہے جس سے اس کی یہ طبعی حالت ایک بھاری خُلق کے رنگ میں آجائے گی اور اس کی تمدنی ضرورت میں بھی فرق نہیں پڑے گا۔ یہی وہ خُلق ہے جس کو احصان اور عفت کہتے ہیں۔"

(اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۲۷ - ۳۰ طبع اوّل ۱۸۹۶ء)

*

اسلامی نکاح کا فلسفہ

۵ - حضرت اقدسؑ کی کتاب "آریہ دھرم" کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اس میں حضور نے متعدد مقامات پر اسلامی نکاح کی حقیقی فلاسفی پر سیر حاصل بحث کی ہے جس سے اسلام کے ازدواجی نظام کی برتری روز روشن کی طرح نمایاں ہوجاتی ہے اس سلسلہ میں "آریہ دھرم" کے تین اقتباسات ہدیہ قارئین کرتا ہوں - ان میں اوّل الذکر دو اقتباس کتاب "احکام اسلام" کے صفحہ نمبر ۱۳۶ و ۱۳۷ پر اور تیسرا اقتباس ۱۵۷ و ۱۵۸ پر موجود ہے ۔

پہلا اقتباس

" قرآن شریف سے ثابت ہوتا ہے کہ شادی کے تین فائدے ہیں - ایک عفت اور پرہیزگاری دوسری حفظِ صحت تیسری اولاد ۔

اور پھر ایک اَور جگہ فرماتا ہے :۔

وَلیستعفف الذین لا یجدون نکاحًا حتّٰی یغنیھم اللہ مِنْ فَضْلِہٖ (الجزو نمبر ۱۸ سورۃ النور)

یعنی جو لوگ نکاح کی طاقت نہ رکھیں جو پرہیزگار رہنے کا اصل ذریعہ ہے تو ان کو چاہیئے کہ اور تدبیروں سے طلب عفت کریں ۔ چنانچہ بخاری

اور مسلم کی حدیث میں آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جو نکاح کرنے پر قادر نہ ہو اس کے لیے پرہیزگار رہنے کے لیے یہ تدبیر ہے کہ وہ روزے رکھا کرے اور حدیث یہ ہے ۔

یا معشر الشباب من استطاع منکم الباءۃ فلیتزوج فانہ اغض للبصر واحصن للفرج ومن لم یستطع فعلیہ بالصوم فانہ لہ وجاء۔ (صحیح مسلم وبخاری)

یعنی اے جوانوں کے گروہ جو کوئی تم میں سے نکاح کی قدرت رکھتا ہو تو چاہیئے کہ وہ نکاح کرے کیونکہ نکاح آنکھوں کو خوب نیچا کر دیتا ہے اور شرم کے اعضاء کو زنا وغیرہ سے بچاتا ہے ورنہ روزہ رکھو کہ وہ خصی کر دیتا ہے ۔"

(آریہ دھرم صہ ۱۹ طبع اوّل ۱۸۹۵ء)

دوسرا اقتباس

"محصنین غیر مسافحین الجزو نمبر ۵ ۔ یعنی چاہیئے کہ تمہارا نکاح اس نیت سے ہو کہ تا تم تقویٰ اور پرہیزگاری کے قلعہ میں داخل ہو جاؤ ۔ ایسا نہ ہو کہ حیوانات کی طرح محض نطفہ نکالنا ہی تمہارا مطلب ہو ۔"

(آریہ دھرم صہ ۱۹ طبع اوّل ۱۸۹۵ء)

٭٭٭

تیسرا اقتباس

"مسلمانوں میں نکاح ایک معاہدہ ہے جس میں مرد کی طرف سے مہر اور تعہد نان ونفقہ اور اسلام اور حسن معاشرت شرط ہے اور عورت کی طرف سے عفت اور پاکدامنی اور نیک چلنی اور فرمانبرداری شرائط ضروریہ میں سے ہے اور جیسا کہ دوسرے تمام معاہدے شرائط کے ٹوٹ جانے سے قابل فسخ ہو جاتے ہیں۔ ایسا ہی یہ معاہدہ بھی شرطوں کے ٹوٹنے کے بعد قابلِ فسخ ہوجاتا ہے۔ صرف فرق یہ ہے کہ اگر مرد کی طرف سے شرائط ٹوٹ جائیں تو عورت خود بخود نکاح توڑنے کی مجاز نہیں ہے جیسا کہ وہ خود بخود نکاح کی مجاز نہیں بلکہ حاکم وقت کے ذریعہ سے نکاح کو توڑا سکتی ہے جیسا کہ ولی کے ذریعہ سے نکاح کو کرا سکتی ہے اور یہ کمی اختیار اس کی فطرتی شتاب کاری اور نقصان عقل کی وجہ سے ہے لیکن مرد جیسا کہ اپنے اختیار سے معاہدہ نکاح کا باندھ سکتا ہے ایسا ہی عورت کی طرف سے شرائط ٹوٹنے کے وقت طلاق دینے میں بھی خود مختار ہے سو یہ قانونِ فطرتی قانون سے ایسی مناسبت اور مطابقت رکھتا ہے گویا کہ اس کی عکسی تصویر ہے کیونکہ فطرتی قانون نے اس بات کو تسلیم کر لیا ہے کہ ہر ایک معاہدہ شرائط قرار دادہ کے فوت ہونے سے قابل فسخ ہوجاتا ہے اور اگر فریق ثانی فسخ سے مانع ہو تو وہ اُس فریق پر ظلم کر رہا ہے جو فقدان شرائط کی وجہ سے فسخ عہد کا حق رکھتا

ہے ۔جب ہم سوچیں کہ نکاح کیا چیز ہے تو بجز اس کے اور کوئی حقیقت معلوم نہیں ہوتی کہ ایک پاک معاہدہ کی شرائط کے نیچے دو انسانوں کی زندگی بسر کرنا ہے اور جو شخص شرائط شکنی کا مرتکب ہو وہ عدالت کی رو سے معاہدہ کے حقوق سے محروم رہنے کے لائق ہو جاتا ہے اور محرومی کا نام دوسرے لفظوں میں طلاق ہے ۔ لہٰذا طلاق ایک پوری پوری جدائی ہے جس سے مطلقہ کی حرکات سے شخص طلاق دہندہ پر کوئی بد اثر نہیں پہنچتا یا دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ ایک عورت کسی کی منکوحہ ہو کر نکاح کے معاہدہ کو کسی اپنی بد چلنی سے توڑ دے تو وہ عضو کی طرح ہے جس کو کیڑے نے کھا لیا اور وہ اپنے شدید درد سے ہر وقت تمام بدن کو ستاتا اور دُکھ دیتا ہے تو اب حقیقت میں وہ دانت دانت نہیں ہے اور نہ وہ متعفن عضو حقیقت میں عضو ہے اور سلامتی اسی میں ہے کہ اس کو اکھیڑ دیا جائے یہ سب کارروائی قانونِ قدرت کے موافق ہے عورت کا مرد سے ایسا تعلق نہیں جیسے اپنے ہاتھ اور پیر کا لیکن تاہم اگر کسی کا ہاتھ یا پیر کسی ایسی آفت میں مبتلا ہو جائے کہ اطباء اور ڈاکٹروں کی رائے اسی پر اتفاق کرے کہ زندگی اس کی کاٹ دینے میں ہے تو بھلا تم میں سے کون ہے کہ ایک جان بچانے کے لیے کاٹ دینے پر راضی نہ ہو پس ایسا ہی اگر تیری منکوحہ اپنی بد چلنی اور کسی مہاں پاپ سے تیرے پر وبال لائے تو وہ ایسا عضو ہے کہ بگڑ گیا اور سڑ گیا اور اب وہ تیرا

عضو نہیں ہے اس کو جلد کاٹ دے اور گھر سے باہر پھینک دے۔ ایسا نہ ہو کہ اس کی زہر تیرے سارے بدن میں پہنچ جائے اور تجھے ہلاک کرے پھر اگر اس کاٹے ہوئے اور زہریلے جسم کو کوئی پرند یا درند کھالے تو تجھے اس سے کیا کام کیونکہ وہ جسم تو اسی وقت سے تیرا جسم نہیں رہا جبکہ تو نے اس کو کاٹ کر پھینک دیا۔" (آریہ دھرم صفحہ ۳۲، ۳۳ طبع اوّل ۱۸۹۵ء)

قبولیتِ دُعا کا فلسفہ

۶۔ سر سیّد احمد خاں بانی علیگڑھ کالج دعاؤں کی قبولیت اور تاثیر کے قائل نہیں تھے جیسا کہ ان کی تفسیروں اور لیکچروں اور مضامین سے ظاہر ہے۔ حضرت اقدس بانی سلسلہ احمدیہ عہدِ حاضر کی وہ منفرد شخصیت ہیں جنھوں نے عقلی و نقلی اور اپنے رُوحانی مشاہدات کی روشنی میں "برکات الدعا" جیسی لاجواب کتاب سُپردِ قلم فرمائی پوری کتاب مطالعہ کرنے کے لائق ہے بطور نمونہ اس کے دو اقتباس ملاحظہ ہوں۔

اوّل :۔ "اگرچہ دنیا کی کوئی خیر و شر مقدر سے خالی نہیں تاہم قدرت نے اس کے حصول کے لیے ایسے اسباب مقرر کر رکھے ہیں جن کے صحیح اور سچے اثر میں کسی عقلمند کو کلام نہیں مثلاً" اگرچہ مقدر پر لحاظ کر کے دوا کا کرنا نہ کرنا درحقیقت ایسا ہی ہے جیسا کہ دعا یا ترکِ دعا۔ مگر کیا سیّد صاحب یہ رائے ظاہر کر سکتے

ہیں کہ مثلاً علمِ طب سراسر باطل ہے اور حکیم حقیقی نے دُعاؤں میں کچھ بھی اثر نہیں رکھا؟ پھر اگر سید صاحب باوجود ایمان بالتقدیر کے اس بات کے بھی قائل ہیں کہ دوائیں بھی اثر سے خالی نہیں تو پھر کیوں خدا تعالیٰ کے یکساں اور متشابہ قانون میں فتنہ اور تفریق ڈالتے ہیں؟ کیا سید صاحب کا یہ مذہب ہے کہ خدا تعالیٰ اس بات پر قادر تھا کہ تربد اور سقمونیا اور سنا اور حب الملوک میں تو ایسا فوری اثر رکھ دے کہ ان کی پوری خوراک کھانے کے ساتھ ہی دست چھوٹ جائیں یا مثلاً سم الفار اور بیش اور دوسری ہلاہل زہروں میں وہ غضب کی تاثیر ڈال دی کہ ان کا کامل قدر شربت چند منٹوں میں ہی اس جہاں سے رخصت کر دے لیکن اپنے برگزیدوں کی توجہ اور عقد ہمت اور تضرع کی بھری ہوئی دُعاؤں کو فقط مردہ کی طرح رہنے دے جن میں ایک ذرہ بھی اثر نہ ہو؟ کیا یہ ممکن ہے کہ نظامِ الٰہی میں اختلاف ہو اور وہ ارادہ جو خدا تعالیٰ نے دواؤں میں اپنے بندوں کی بھلائی کے لیے کیا تھا وہ دعاؤں میں مرعی نہ ہو؟ نہیں نہیں! ہرگز نہیں!! بلکہ خود سید صاحب دعاؤں کی حقیقی فلاسفی سے بے خبر ہیں اور ان کی اعلیٰ تاثیروں پر ذاتی تجربہ نہیں رکھتے اور ان کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی ایک مدت تک ایک پرانی اور سال خوردہ اور مسلوب القویٰ دوا کو استعمال کرے اور پھر اس کو بے اثر پاکر اس دوا پر عام حکم لگا وے کہ اس میں کچھ بھی تاثیر نہیں۔"

(برکات الدعا صفحہ ۷-۸)

دوم :- "میں کہتا ہوں کہ یہی حال دواؤں کا بھی ہے۔ کیا دواؤں نے موت کا دروازہ بند کر دیا ہے یا ان کا خطا جانا غیر ممکن ہے؟ مگر کیا باوجود اس بات کے کوئی ان کی تاثیر سے انکار کر سکتا ہے؟ یہ سچ ہے کہ ہر ایک امر پر تقدیر محیط ہو رہی ہے۔ مگر تقدیر نے علوم کو ضائع اور بے حرمت نہیں کیا اور نہ اسباب کو بے اعتبار کر کے دکھلایا بلکہ اگر غور کر کے دیکھو تو یہ جسمانی اور رُوحانی اسباب بھی تقدیر سے باہر نہیں ہیں مثلاً اگر ایک بیمار کی تقدیر نیک ہو اسباب تقدیر علاج پورے طور پر میسّر آ جاتے ہیں اور جسم کی حالت بھی ایسے درجہ پر ہوتی ہے کہ وہ اُن سے نفع اٹھانے کے لیے مستعد ہوتا ہے۔ تب دوا نشانہ کی طرح جا کر اثر کرتی ہے۔ یہی قاعدہ دُعا کا بھی ہے۔ یعنی دُعا کے لیے بھی تمام اسباب و شرائط قبولیت اسی جگہ جمع ہوتے ہیں جہاں ارادۂ الٰہی اس کے قبول کرنے کا ہے۔" ("برکات الدعا" صفحہ ۱۱ و ۱۲)

جناب "حکیم الامت مجدّد الملت" مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نے "برکات الدعا" کے مندرجہ بالا دونوں اقتباسات اگرچہ نہایت اہتمام کے ساتھ اپنی مقبولِ عام کتاب کے صفحہ ۸۴، ۸۵ پر "حقیقت دعا و قضا" کے عنوان سے قلمبند فرما دیئے ہیں مگر جس جس فقرے میں سرسیّد کا نام تھا اس کو "کمال فطانت و ذہانت" سے دوسرے الفاظ میں بدل ڈالا ہے۔

☆

قبور سے تعلق ارواح

۷۔ مندرجہ بالا عنوان سے "احکام اسلام" کے صفحہ ۲۶۲ سے ۲۶۵ تک ایک نہایت لطیف مضمون بیان ہوا ہے جو اوّل سے آخر تک براہ راست حضرت اقدس کے ان ملفوظات سے ماخوذ ہے جو آج سے قریباً چوراسی[۸۴] سال قبل اخبار الحکم میں شائع ہوئے تھے۔ حضور نے فرمایا:۔

"اصل بات یہ ہے کہ جو کچھ ارواح کے تعلقِ قبور کے متعلق احادیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں آیا ہے وہ بالکل سچ اور درست ہے۔ ہاں یہ دوسرا امر ہے اس کے تعلق کی کیفیت اور کُنہ کیا ہے؟ جس کے معلوم کرنے کی ہم کو ضرورت نہیں۔ البتہ یہ ہمارا فرض ہو سکتا ہے کہ ہم یہ ثابت کر دیں کہ اس قسم کا تعلق قبور کے ساتھ ارواح کا ہوتا ہے اور اس میں کوئی محالِ عقل لازم نہیں آتا۔ اور اس کے لیے ہم اللہ تعالیٰ کے قانونِ قدرت میں ایک نظیر پاتے ہیں۔ درحقیقت یہ امر اسی قسم کا ہے جیسے ہم دیکھتے ہیں کہ بعض امور کی سچائی اور حقیقت صرف زبان ہی سے معلوم ہوتی ہے اور اس کو ذرا وسیع کرکے ہم یوں کہتے ہیں کہ حقائق الاشیاء کے معلوم کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے مختلف طریقے رکھے ہیں بعض خواص آنکھ کے ذریعے معلوم ہوتے ہیں اور بعض صداقتوں کا پتہ صرف کان لگاتا ہے اور بعض ایسی ہیں کہ حسِ مشترک سے ان کا سراغ چلتا ہے

اور کتنی ہی سچائیاں ہیں کہ وہ مرکزِ قویٰ یعنی دل سے معلوم ہوتی ہیں۔ غرض اللہ تعالیٰ نے صداقت کے معلوم کرنے کے لیے مختلف طریق اور ذریعے رکھے ہیں مثلاً مصری کی ایک ڈلی کو اگر کان پر رکھیں تو وہ اس کا مزہ معلوم نہ کر سکیں گے اور نہ اس کے رنگ بتا سکیں گے۔ ایسا ہی اگر آنکھ کے سامنے کریں گے تو وہ اس کے ذائقہ کے متعلق کچھ نہ کہہ سکے گی۔ اس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ حقائق الاشیاء کے معلوم کرنے کے لیے مختلف قویٰ اور طاقتیں ہیں۔ اب آنکھ کے متعلق اگر کسی چیز کا ذائقہ معلوم کرنا ہو اور وہ آنکھ کے سامنے پیش ہو تو کیا ہم یہ کہیں گے کہ اس چیز میں کوئی ذائقہ ہی نہیں۔ یا آواز نکلتی ہو اور کان بند کر کے زبان سے وہ کام لینا چاہیں تو کب ممکن ہے۔ آجکل کے فلسفی مزاج لوگوں کو یہ بڑا دھوکا لگا ہوا ہے کہ وہ اپنے عدمِ علم کی وجہ سے کسی صداقت کا انکار کر بیٹھتے ہیں۔ روزمرہ کے کاموں میں دیکھا جاتا ہے کہ سب کام ایک شخص نہیں کرتا بلکہ جُداگانہ خدمتیں مقرر ہیں۔ سقہ پانی پلاتا ہے۔ دھوبی کپڑے صاف کرتا ہے۔ باورچی کھانا پکاتا ہے۔ غرضیکہ تقسیم محنت کا سلسلہ ہم انسان کے خود ساختہ نظام میں بھی پاتے ہیں۔ پس اس اصل کو یاد رکھو کہ مختلف قوتوں کے مختلف کام ہیں۔ انسان بڑے قویٰ لے کر آیا ہے اور طرح طرح خدمتیں اس کی تکمیل کے لیے ہر ایک قوت کے سپرد ہیں۔ نادان فلسفی ہر بات کا فیصلہ اپنی

عقل خام سے چاہتا ہے۔ حالانکہ یہ بات غلط محض ہے تاریخی امور تو تاریخ ہی سے ثابت ہوں گے اور خواص الاشیاء کا تجربہ بدُوں تجربہ صحیحہ کے کیونکر لگ سکے گا۔ امور قیاسیہ کا پتہ عقل دے گی۔ اسی طرح پر متفرق طور پر الگ الگ ذرائع ہیں۔ انسان دھوکہ میں مبتلا ہوکر حقائق الاشیاء کے معلوم کرنے سے تب ہی محروم ہوجاتا ہے جبکہ وہ ایک ہی چیز کو مختلف امور کی تکمیل کا ذریعہ قرار دے لیتا ہے۔ مَیں اس اُصول کی صداقت پر زیادہ کہنا ضروری نہیں سمجھتا کیونکہ ذراسے فکر سے یہ بات خوب سمجھ میں آجاتی ہے اور روزمرّہ ہم ان باتوں کی سچائی دیکھتے ہیں۔ پس جب روح جسم سے مفارقت کرتی ہے یا تعلّق پکڑتی ہے تو ان باتوں کا فیصلہ عقل سے نہیں ہوسکتا۔ اگر ایسا ہوتا تو فلسفی اور حکماء ضلالت میں مبتلا نہ ہوتے۔ اسی طرح قبور کے ساتھ جو تعلّق ارواح کا ہوتا ہے۔ یہ ایک صداقت تو ہے مگر اس کا پتہ دینا اس کی آنکھ کا کام نہیں۔ یہ کشفی آنکھ کا کام ہے کہ وہ دکھلاتی ہے۔ اگر محض عقل سے اس کا پتہ لگانا چاہو تو کوئی عقل کا پُتلا اتنا ہی بتائے کہ رُوح کا وجود بھی ہے یا نہیں؟ ہزار اختلاف اس مسئلہ پر موجود ہیں اور ہزارہا فلاسفر دہریہ مزاج موجود ہیں جو منکر ہیں۔ اگر نری عقل کا یہ کام تھا تو پھر اختلاف کا کیا کام؟ کیونکہ جب آنکھ کا کام دیکھنا ہے تو مَیں نہیں کہہ سکتا کہ زیدؔ کی آنکھ تو سفید چیز کو دیکھے اور بکرؔ کی ویسی ہی آنکھ اس سفید چیز کا ذائقہ بتلائے۔ میرا مطلب

یہ ہے کہ نری عقل رُوح کا وجود بھی یقینی طور پر نہیں بتلا سکتی۔ چہ جائیکہ اس کی کیفیت اور تعلقات کا علم پیدا کر سکے۔ فلاسفر تو رُوح کو ایک سبز ٹکڑی کی طرح مانتے ہیں اور وہ روح فی الخارج ان کے نزدیک کوئی چیز ہی نہیں۔ یہ تفاسیر رُوح کے وجود اور اس کے تعلق وغیرہ کی چشمۂ نبوت سے ملی ہیں اور نرے عقل والے تو دعویٰ ہی نہیں کر سکتے اگر کہو کہ بعض فلاسفروں نے کچھ لکھا ہے تو یاد رکھو کہ انہوں نے منقولی طور پر چشمۂ نبوت سے کچھ لے کر کہا ہے۔ پس جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ رُوح کے متعلق علوم چشمہ نبوت سے ملتے ہیں تو یہ امر کہ ارواح کا قبور کے ساتھ تعلق ہوتا ہے، اسی چشمہ سے دیکھنا چاہیئے اور کشفی آنکھ نے بتلایا ہے کہ اس تودہ خاک سے روح کا ایک تعلق ہوتا ہے اور اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ یَا اَھْلَ الْقُبُوْرِ کہنے سے جواب ملتا ہے۔ پس جو آدمی ان قویٰ سے کام لے جن سے کشفِ قبور ہو سکتا ہے وہ ان تعلقات کو دیکھ سکتا ہے۔

ہم ایک بات مثال کے طور پر پیش کرتے ہیں کہ ایک نمک کی ڈلی اور ایک مصری کی ڈلی رکھی ہو۔ اب عقل محض ان پر کیا فتویٰ دے سکے گی۔ ہاں اگر ان کو چکھیں گے تو جُداگانہ مزوں سے معلوم ہو جاوے گا کہ یہ نمک ہے اور وہ مصری ہے لیکن اگر حِسّ انسان ہی نہیں تو نمکین اور شیریں کا فیصلہ کوئی کیا کریگا؟ پس ہمارا کام صرف دلائل سے سمجھا دینا ہے۔ آفتاب کے چڑھنے میں

جیسے ایک اندھے کے انکار سے فرق نہیں آ سکتا اور ایک مسلوب القوۃ کے طریقِ استدلال سے فائدہ نہ اٹھانے سے ان کا ابطال نہیں ہو سکتا ۔ اسی طرح پر اگر کوئی شخص کشفی آنکھ نہیں رکھتا تو وہ اس تعلق ارواح کو کیونکر دیکھ سکتا ہے؟ پس اس کے انکار سے محض اس لیے کہ وہ دیکھ نہیں سکتا ۔ اس کا انکار جائز نہیں ہے ایسی باتوں کا پتہ نِری عقل اور قیاس سے کچھ نہیں لگتا ۔ اللہ تعالیٰ نے اس لیے انسان کو مختلف قویٰ دیئے ہیں اگر ایک ہی سب کام دیتا تو پھر اس قدر قویٰ کے عطا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ بعض کا تعلق آنکھ سے ہے اور بعض کا کان سے بعض زبان سے متعلّق ہیں اور بعض ناک سے ۔ مختلف قسم کی حِسّیں انسان رکھتا ہے ۔ قبور کے ساتھ تعلق ارواح کے دیکھنے کے لیے کشفی قوّت اور حِسّ کی ضرورت ہے اگر کوئی کہے کہ یہ ٹھیک نہیں ہے ۔ تو وہ غلط کہتا ہے ۔ انبیاء علیہم السّلام کی ایک کثیر تعداد کروڑ ہا اولیاء وصلحاء کا سلسلہ دُنیا میں گزرا ہے اور مجاہدات کرنے والے بے شمار لوگ ہو گزرے ہیں اور وہ سب اس امر کی زندہ شہادت ہیں گو اس کی اصلیت اور تعلقات کی وجہ عقلی طور پر ہم معلوم کر سکیں یا نہ ، مگر نفسِ تعلّق سے انکار نہیں ہو سکتا ۔ غرض کشفی دلائل ان ساری باتوں کا فیصلہ کیے دیتے ہیں ۔ کان اگر نہ دیکھ سکیں تو ان کا کیا قصور؟ وہ اور قوت کا کام ہے ۔ ہم اپنے ذاتی تجربہ سے گواہ ہیں کہ رُوح کا تعلق قبر کے ساتھ ضرور ہوتا ہے ۔ انسان میّت سے کلام کر سکتا ہے ۔ روح کا تعلق آسمان سے

بھی ہوتا ہے جہاں اس کیلئے ایک مقام ملتا ہے۔ میں پھر کہتا ہوں کہ یہ ایک ثابت شدہ صداقت ہے۔ ہندوؤں کی کتابوں میں بھی اس کی گواہی موجود ہے یہ مسئلہ عام طور پر مسلّمہ مسئلہ ہے بجز اس فرقہ کے جو نفئ بقائے روح کرتا ہے۔"

(الحکم جلد نمبر ۳ صفحہ ۲،۳ پرچہ ۲۴ر جنوری ۱۸۹۹ء)

یہاں اس امر کا تذکرہ ضروری ہے کہ حضرت اقدسؑ کو چونکہ جناب الٰہی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی متابعت کی برکت سے کشفی آنکھیں بخشیں اور آسمانی نور سے بہرہ ور فرمایا تھا۔ اس لیے آپ نے ارواح کے تعلقِ قبور کا ذکر کرتے ہوئے ببانگ دہل اعلان فرمایا کہ "ہم اپنے ذاتی تجربہ سے گواہ ہیں۔" مگر کتاب "احکام اسلام" کے مصنف کو ایسا کوئی دعویٰ نہیں تھا نہ ہو سکتا تھا اس لیے انہوں نے اپنی کتاب میں حضرت اقدسؑ کے ملفوظات کا طویل اقتباس نقل کرتے ہوئے اس کے بعض الفاظ قلمزن فرما دیئے جو بلاشبہ حق پسندی کا ایک قابلِ تعریف نمونہ ہے اسے کاش وہ کتاب "احکام اسلام" کے اصل ماخذ کے برملا اظہار کی جرأت بھی فرما سکتے !!!

خلاصہ

مندرجہ بالا تفصیلی جائزہ اور موازنہ سے متعدد حقائق ہمارے سامنے آتے ہیں مثلاً

۱۔ عہدِ حاضر میں اسلامی تعلیمات کے حقیقی فلسفہ کی نقاب کشائی کا اصل سہرا

حضرت بانی سلسلۂ احمدیہ علیہ السلام کے سر ہے۔

۲۔ حضرت اقدس کے قلم مبارک سے نکلا ہوا بلند پایہ لٹریچر علمی اعتبار ہی سے نہیں ادبی حیثیت سے بھی عدیم المثال ہے یہی وجہ ہے کہ بعض بڑے بڑے قادر الکلام ادیب و خطیب یا صاحب تصانیف کثیرہ بھی آپ کے بیان فرمودہ اسرار و غوامض کو اپنے الفاظ میں ادا ہی نہیں کر سکتے اور انہیں قدم قدم پر آپ ہی کے الفاظ، محاورات اور فقرات کو بے دریغ استعمال کرنا اور ان کا مسلسل سہارا لینا پڑتا ہے۔ ممکن ہے ذہن اسے علمی سرقہ کا نام دینے کی جسارت کرے مگر میں تو اسے مجبوری و معذوری ہی سے تعبیر کروں گا۔ والطریقۃ کلّہا ادب۔

۳۔ قرآن مجید کی آیات کا جو بامحاورہ اور سلیس اردو ترجمہ حضرت اقدسؑ کے قلم مبارک سے نکلا ہے وہ قرآنی مفہوم کی صحیح صحیح عکاسی کرتا ہے جس پر کتاب "احکام اسلام" شاہد عادل ہے لہٰذا ہمیں چاہیئے کہ ہم اس کے لفظ لفظ کو حرز جان بنائیں تا غیر مسلم دنیا قرآن اور اسلام کی صحیح تصویر سے واقف ہو اور اس کے حسن و احسان پر دل و جان سے فریفتہ ہو کر محسنِ انسانیت فخرِ دو عالم شہنشاہ دو عالم خاتم الانبیاء محمد مصطفیٰ صلّی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں جمع ہو جائے خدا کرے کہ وہ دن جلد آجائے۔ آمین ‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌(الفضل ۵ و ۷ مئی ۱۹۸۳ء ناشر)
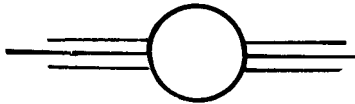
ایک غیر از جماعت مبصر کا مکتوب گرامی مقالہ نویس کے نام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزتِ مآب صاحب الفضیلۃ لائقِ صد احترام مولانا دوست محمد صاحب شاہد

السلام علیکم!

۵ اور ۷ مئی ۱۹۸۳ء کے "الفضل" میں آپ کی تحقیق بے نظیر دیکھنے کا موقع ملا جو یقیناً چونکا دینے والی بات تھی اور ایک بہت فاضل آدمی کی علمیت کا پول کھولنے کے لیے کافی تھی۔ اس سلسلے میں جوابی کارروائی کے طور پر "ماہنامہ الرشید ساہیوال" میں مولوی خالد محمود صاحب کا مضمون شائع ہوا ہے جس میں تین ۳ اہم دلائل دیئے گئے ہیں۔

۱۔ ان کا پہلا دعویٰ یہ ہے کہ یہ کہیں سے ثابت نہیں کہ خود مولانا تھانوی صاحب نے مرزا صاحب کی کُتب سے سرقہ کیا ہے۔

۲۔ ایک اَور مصنّف جس نے مرزا صاحب سے سرقہ کیا ہو اُن سے مولانا نے وہ مضامین لیے ہوں۔

۳۔ ایک اَور مصنّف جس سے مرزا صاحب نے مضامین لیے ہوں اُس سے مولانا اشرف علی صاحب نے بھی لیے ہوں۔

(۱) جہاں تک مولوی خالد محمود صاحب کی پہلی دلیل کا تعلّق ہے کہ یہ کہیں سے ثابت نہیں ہوتا کہ خود مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نے بانیٔ سلسلہ احمدیہ

مرزا غلام احمد صاحب کی کُتب سے براہِ راست یہ مضامین لیے ہیں۔ بالکل بے وزن دلیل ہے کیونکہ وہ اسی مضمون میں یہ اعتراف کر بھی چکے ہیں کہ حضرت تھانوی چاہتے تو اس مؤلف پر سرقہ کا الزام بھی لگا سکتے تھے لیکن اونچے درجہ کے بزرگ ان باتوں میں پڑنا مناسب نہیں سمجھتے اگر وہ ایسا کرتے تو پھر بہت ممکن ہے کہ یہ بات نکلتی کہ مرزا غلام احمد نے احکام اسلام کے مصالح عقلیہ اصولاً جن کتابوں سے لیے ہیں اس نے ان کتابوں کا حوالہ کیوں نہیں دیا؟ آخر کیوں؟ کیا یہ سب باتیں مرزا غلام احمد کی اپنی طبع زاد ہیں یا اُس نے بھی "بھی" قابلِ غور ہے۔ ناقل) ہمارے اکابر سے ہی لی ہیں"؟ (ماہنامہ الرشید ص۲۷)، اِس عبارت سے تو اظہر من الشمس کی طرح عیاں ہو جاتا ہے کہ مولانا اشرف علی صاحب کو یہ معلوم تھا کہ یہ عبارات مرزا صاحب کی کتب میں موجود ہیں چونکہ "احکامِ اسلام" کے مقدمہ میں وہ اس بات کی کُھلی تائید کر رہے ہیں، مولانا فرماتے ہیں۔ "چنانچہ اس وقت بھی ایک ایسی ہی کتاب جس کو کسی صاحب قلم نے لکھا ہے مگر علم و عمل کی کمی کے سبب تمام تر رطب و یابس و غث دسمین سے پُر ہے ایک دوست کی بھیجی ہوئی میرے پاس دیکھنے کی غرض سے آئی ہوئی رکھی ہے .... احقر نے غائت بے تعصبی سے اس میں بہت سے مضامین کتاب مذکورہ بالا سے بھی جو کہ موصوف بصحت تھے لیے ہیں"۔ سے مکمل طور پر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شخص جس کی کتاب سے مولانا نے مضامین لیے ہیں یقیناً اُن کے

نزدیک وہ مرزا صاحب ہی تھے کیونکہ جو مستعار عبارت اُن کی کتاب کی زینت بنی ہوئی ہیں وہ کسی اَور کتاب میں (سوائے مرزا صاحب کی کتب کے) تو بہر حال موجود نہیں۔ اس لیے لاریب اس امر میں تو شک کی گنجائش نہیں کہ مولانا اشرف علی صاحب نے مرزا صاحب کی تصنیفات سے کسبِ فیض کیا ہے اور مولانا خالد محمود صاحب کا یہ دعویٰ" لیکن یہ بات کہ حضرت تھانوی نے یہ مضامین مرزا صاحب کی کتابوں سے لیے ہیں کسی طرح لائق پذیرائی نہیں" بالکل بے جان ہو کر رہ جاتا ہے۔

(۲) فاضل مضمون نگار کی دوسری قیاسی دلیل کہ" یہ بھی ممکن ہے کہ اس مصنف نے مرزا صاحب کی کتابوں سے یہ مضامین حوالہ دیئے بغیر لیے ہیں اور احکام اسلام کے موافقِ عقل ہونے پر اپنے خیالات سے اور مرزا صاحب کے اقتباسات سے ایک نئی کتاب مرتب کر دی ہو اَور پھر حضرۃ تھانوی نے اس کتاب سے یہ مضامین اپنی اس تالیف میں لے لیے ہوں"۔ (ماہنامہ الرشید صفحہ ۲۵)... یہ تو بازو گھما کر ناک پکڑنے والی بات ہے۔

(۳) تیسری" دلیل" جو مولوی خالد محمود صاحب نے دی ہے اس کی بنیاد کچھ اس طرح بنائی ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی کی تصنیفِ بے بدل میں یہ مضامین موجود ہیں (مولانا اشرف علی صاحب تھانوی بھی اپنی کتاب کے مقدمے میں اسی خیال کی تائید ان الفاظ میں کرتے ہیں۔" اس مبحث میں ہمارے

زمانے سے کسی قدر پہلے زمانہ میں حضرت مولانا شاہ ولی اللہ حجۃ اللہ البالغہ لکھ چکے ہیں اور بہت زیادہ حصہ ان مضامین کا حجۃ البالغہ سے ماخوذ تھا جیساکہ بعد اخذ کے حجۃ اللہ البالغہ کے دیکھنے سے معلوم ہوا" صـ۱۵) اسی سے مرزا غلام احمد صاحب نے مضامین لیے ہوں اور اُسی سے مولانا اشرف علی صاحب نے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ قیاس بھی محض قیاس ہی ہے کیونکہ فاضل مضمون نگار اپنے اس دعویٰ کی تائید میں بھی کوئی دلیل پیش نہ کرسکے کہ حجۃ اللہ البالغہ کی فلاں عبارت مرزا صاحب نے بلا حوالہ اپنی کتاب میں درج کی ہے اس لیے مولوی خالد محمود صاحب کی یہ دلیل بھی متاثر نہ کرسکی۔ اِس سلسلہ میں دوسری قابلِ غور بات یہ ہے کہ اشرف علی صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ کا اُردو ترجمہ اس کتاب کی تصنیف تک تو دیکھا ہی نہیں تھا کیونکہ وہ "احکام اسلام" کے مقدمہ میں "حجۃ البالغہ" کے بارے میں لکھتے ہیں "اس مبحث میں ہمارے زمانہ سے کسی قدر پہلے زمانہ میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب حجۃ اللہ البالغہ لکھ چکے ہیں سُنا ہے کہ ترجمہ اس کا بھی ہوچکا ہے —

(خط کشیدہ جملے سے یہ منترشح ہوتا ہے کہ اشرف علی صاحب محض سنی سنائی بات کر رہے ہیں یہ نہیں کہہ رہے کہ مَیں نے وہ ترجمہ دیکھا ہے اور اس میں بھی وہی عبارات بعینہٖ موجود ہیں جوکہ مَیں "رطب و یابس" سے پُر کتاب سے لے رہا ہوں۔

جناب خالد محمود صاحب کا یہ مضمون پڑھکر مَیں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ

اُن کے دلائل بے وزن تھے اَور وہ ہرگز یہ ثابت نہیں کر سکے کہ مولانا اشرف علی صاحب نے یہ عبارات مرزا غلام احمد صاحب کی کتب کی بجائے فلاں فلاں کتب سے لی ہیں ۔ لاریب اس میں کوئی کلام نہیں کہ مولانا اشرف علی صاحب نے بانیٔ سلسلہ احمدیہ کی کتب سے اکتساب فیض کیا ہے کیونکہ بہرحال "احکام اسلام" کے ورق ورق پر مرزا غلام احمد صاحب کی عبارات موجود ہیں ۔ ایک اَور الزام جوکہ آپ پر لگایا گیا ہے جس میں بھی مولوی خالد محمود صاحب نے بھرپور دجل اَور فریب سے کام لیا ہے اَور یہ ظاہر کیا ہے کہ آپ نے احکام اسلام کے مقدمے کی تحریر کو جان بُوجھ کر چھپایا ہے جس میں تھانوی صاحب نے کسی مصنّف کی کسی تصنیف سے استفادہ کرنے کا اقرار کیا ہے حالانکہ آپ کا یہ اعتراض تو شروع سے تھا ہی نہیں کیونکہ "الفضل" کے مذکورہ مقالے میں یہ جملہ "مولانا اشرف علی صاحب نے کہیں بھول کر بھی ان کے متعلق ساری کتاب میں ذکر نہیں فرمایا کہ یہ کسی مصنّف کی تصنیف سے لیے ہیں"۔ (الرشید ص۲۵) موجود نہیں ۔ ہاں البتہ اس مقالے کی تلخیص ۱۲ مئی کو "لاہور" رسالے میں شائع ہوئی تھی مگر اُس میں بھی یہ جُملہ اس طرح موجود نہیں بلکہ تھوڑے سے لفظی تغیر کے ساتھ ص۲۵ "لاہور" ص۴ میں اِن الفاظ کے ساتھ موجود ہے "اور کہیں بھول کر بھی ان کے متعلق ساری کتاب میں ذکر نہیں فرمایا کہ یہ کِس مصنف کی کس تصنیف سے لیے ہیں" لفظ کِس کو کسی میں تبدیل کر دینے سے مفہوم

بکلّی تبدیلی ہوجاتا ہے۔ کیونکہ لفظ "مصنف" اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ محقق کو اِس بات کا علم ہے کہ مولانا اشرف علی صاحب "کسی مصنف" سے اکتساب فیض کا اقرار کر چکے ہیں۔ آپ کا سوال بالکل بجا ہے کہ اس مصنف اور اس کی تصنیف کا نام بتایا جائے اور واقعتاً آپ کے مقالے میں اصل سوال بھی یہی تھا کہ مولانا اشرف علی صاحب نے اس مصنف اور اس کی تصنیف کا نام ظاہر کرنے سے کیوں گریز کیا؟

آخر یہ

آپ کی اس مایہ ناز تحریر سے ...... دیوبندی مکتبۂ فکر میں زلزلہ آگیا ہے ماہنامہ "الرشید" میں مولوی خالد محمود صاحب دیوبندی کی تحریر عذرِ گناہ بدتر از گناہ کی واضح مثال ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کا حامی و ناصر ہو اور آپ کی اس مایہ ناز تحقیق پر خدا تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے آمین.. ......"

خاکسار

جمیل احمد عدیل

۲۳ جولائی ۱۹۸۳ء

عبدالماجد خوشنویس ربوہ

لاہور آرٹ پریس۔ انارکلی لاہور

مصطفٰے پر ترا بیحد ہو سلام اور رحمت

ہر طرف فکر کو دوڑا کے تھکایا ہم نے
کوئی دیں دینِ محمدؐ سا نہ پایا ہم نے

کوئی مذہب نہیں ایسا کہ نشاں دکھلائے
یہ ثمر باغِ محمدؐ سے ہی کھایا ہم نے

ہم نے اسلام کو خود تجربہ کر کے دیکھا
نور ہی نور اُٹھو دیکھو سُنایا ہم نے

اور دینوں کو جو دیکھا تو کہیں نور نہ تھا
کوئی دِکھلائے اگر حق کو چھپایا ہم نے

تھک گئے ہم تو انہی باتوں کو کہتے کہتے
ہر طرف دعوتوں کا تیر چلایا ہم نے

آزمائش کیلئے کوئی نہ آیا ہر چند
ہر مخالف کو مقابل پہ بلایا ہم نے

یونہی غفلت کے لحافوں میں پڑے سوتے ہیں
وہ نہیں جاگتے سَو بار جگایا ہم نے

جل رہے ہیں یہ سبھی بُغضوں میں اور کینوں میں
باز آتے نہیں ہر چند ہٹایا ہم نے

آؤ لوگو! کہ یہیں نُورِ خدا پاؤ گے!!
لو تمھیں طورِ تسلّی کا بتایا ہم نے

آج اِن نوروں کا اِک زور ہے اِس عاجز میں
دِل کو اِن نوروں کا ہر رنگ دِلایا ہم نے

جب سے یہ نور ملا نورِ پیمبرؐ سے ہمیں
ذات سے حق کی وجود اپنا ملایا ہم نے

مصطفٰے پر ترا بیحد ہو سلام اور رحمت
اُس سے یہ نور لیا بارِ خدایا ہم نے